ہوگی۔

خاتمہ!

دنیا کے ساتھ معاملات کرتے ہوئے اس کی ضرورت پیش آئے گی کہ بالغ نظری، مستقبل بینی اور اپنے آپ کو روک رکھنے کی ایسی صفات کا مظاہرہ کیا جائے جواب تک امریکہ کی موجودہ خارجہ پالیسی سے بالکل خارج محسوس ہوئی ہیں۔ اگر امریکہ چاہتا ہے کہ اس کا خصوصی مقام دوسرے لوگوں کے لیے بھی قابل قبول ہو، تو امریکہ کو ایسا سیاسی رویہ اختیار کرنا ہوگا جس سے بین الاقوامی معاملات سنجیدہ اور منظم طرز عمل سے حل ہو جائیں۔ ماضی میں ایسا ہوتا رہا ہے کہ جوہری اسلحہ، سمندری محفوظ مقام (Oceanic moat)، نیز غیر معمولی عسکری اور اقتصادی برتری کے پردے کی بدولت، نیز غیر ملکی آراساز (Lobbyists) اور مقامی مخصوص مفادات کے حامل ادارے ہماری کانگرس کے غیر ذمہ دار مرعوب ممبران کو خارجہ پالیسی کے معاملے میں بھٹکا لیے گئے۔ اگر چہ امریکہ کا دعویٰ ہے کہ یہ دنیا کی واحد عالمی طاقت ہے۔ اطلاعات اور جاسوسی کے معاملے میں کافی پیچھے ہے۔ اس کی خارجہ تعلقات کا بجٹ کم کر دیا گیا، معاشرے کے قابل ترین افراد کو حکومتی اداروں میں لانے کے لیے کچھ نہ کیا گیا۔ دوسری زبانوں اور دوسری تہذیبوں کو سیکھنے کی کوشش نہ کی گئی اور ایسا سلوک روا رکھا گیا گویا امریکہ کی خارجہ پالیسی اچھی رہے نہ رہے، کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر القاعدہ کے ہولناک اقدام سے امریکہ کو یقین آ گیا ہوتا، کہ اب بیدار ہو جانے کا وقت آ گیا ہے اور وہ کام کرنا چاہیں کہ جو ایک عالمی طاقت کے شایان شان ہوں، تو بن لادن کے لوگوں نے اتنے انسانوں کو موت کے گھاٹ نہ اتارا ہوتا۔

[سٹیفن ایم والٹ، پروفیسر برائے بین الاقوامی امور، جان ایف کینیڈی سکول آف گورنمنٹ، ہارورڈ یونیورسٹی]

دہشت، اسلام اور جمہوریت

تحریر: لادن بورومانڈ، اور رویا بورومانڈ*

ترجمہ: محمد نسیم فاروقی

''کیوں؟'' وہ سوال ہے جو دیارِ مغرب کے لوگ گیارہ ستمبر کے وحشتناک واقعات کے بعد سے پوچھتے رہے ہیں۔ان دہشت گردوں کے رجحانات، ایقانات اور محرکات کیا تھے اور کس تحریک سے یہ ابھر کر آئے؟ مسلمان ملکوں کے نوجوانوں کو آخر کیا چیز اس بات پر آمادہ کرتی ہے بلکہ خواہش مند بناتی ہے کہ وہ خودکش بمباز ہو جائیں؟ مغرب اور بالخصوص ریاست ہائے متحدہ امریکہ سے انتہائی شدید نفرت کیسے وہ اپنے دماغوں میں بٹھا لیتے ہیں؟ اس دن قاتلانہ جنونیت کا جو مشاہدہ ہم نے کیا اس کی جڑیں کس نوعیت کی ہیں، اخلاقی، ذہنی، سیاسی یا روحانی؟

جوں جوں مغربی ماہرین اور تبصرہ نگاروں نے ان سوالات پر مغز زنی کی انقلابی اسلامیت (Redical Islamism) (خیال رہے کہ ہم نے ان کو'اسلامی' قرار نہیں دیا) کے مقابلے میں ان کا ذہنی انتشار اور بے چارگی تکلیف دہ حد تک واضح ہوتی چلی گئی۔تشویش ناک امر یہ ہے کہ فوری طور پر اس کا مسلح جواب، خواہ کتنا بھی لازمی ہو گیا ہو یہ بات نا قابل تردید ہے کہ اسلامیت اور اس کی دہشت گردی سے نبرد آزمائی کے لیے ایک کامیاب طویل مدتی حکمت عملی وضع کرنے کے لیے اس چیز کا زیادہ واضح ادراک درکار ہوگا کہ دشمن کون ہیں، وہ کیا سوچتے ہیں اور اپنے مقاصد کے بارے میں ان کا اپنا فہم کیا ہے؟ کیوں کہ دہشت گردی آزادانہ جمہوریت کے خلاف اولین نظریاتی اور اخلاقی چیلنج ہوتی ہے۔جمہوریت کے مدعی جتنا جلد اس کا احساس کر لیں اور اس کے مضمرات کا شعور پیدا کر لیں تو اتنا ہی جلد جمہوریت اس بات کے لیے تیاری کر سکے گی کہ نظریات اور اقدار کی اس طویل سلگتی ہوئی جنگ کو جو گیارہ ستمبر کو اپنی پوری

* Ladan Boroumand and Roya Boroumand, "Terror, Islam and Democracy," *Journal of Democracy*, Vol. 13, No. 2, April 2002, pages:5-19.

غضب ناکی کے ساتھ پھوٹ پڑی تھی، جیت لے۔

اسلام پسندوں کی دہشت گردی کے سامنے آزاد رُو جمہوریتیں جس الجھن کا شکار ہیں وہ گزشتہ تاریخ کے مقابلے میں خاصی عجیب ہے۔۱۷۹۳ء سے جب ''دہشت'' کی اصطلاح موجودہ سیاسی معنوں میں پہلی بار انقلاب فرانس کی بعینہٖ ''دہشت'' کے بارے میں استعمال کی گئی تھی، مغرب کے تقریباً ہر ملک کو کسی نہ کسی دہشت گرد تحریک یا حکومت سے کسی حد تک نمٹنا پڑا تھا۔ پھر کیوں مغربی تجزیہ نگار اسلام پسندی کی مثال میں عاجز دکھائی دیتے ہیں جبکہ خود آزاد رُو جمہوریت بھی زمانۂ جدید کی پیداوار ہے۔

اسلام پسندی کی دہشت، پہلی بار ۱۹۷۹ء کے ایرانی انقلاب کے ساتھ ابھر کر سامنے آئی جب کہ اس سال نومبر میں تہران کے امریکی سفارت خانے پر قبضہ کر لیا گیا تھا۔ اس وقت سے اسلام پسندی میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور وہ تمام نظریاتی اور سیاسی حربے اس کا سدباب کرنے میں ناکام رہے جو مغرب کے طول و عرض میں دہشت گردی کو کچل ڈالنے میں کامیاب رہے تھے۔ اب اس کا وجود عالم گیر ہے اور اس کا اثر نہ صرف مغرب کی طرف مراکش اور نائیجیریا سے مشرق میں ملائیشیا اور منڈاناؤ تک کی وسیع اسلامی ہلال کی سرزمینوں میں محسوس ہوتا ہے بلکہ یورپ کے بہت سے حصوں، بھارت، سابق روسی دنیا، امریکہ بلکہ مغربی چین کے کچھ حصوں میں بھی پایا جاتا ہے۔

ایرانی انقلاب سے پیشتر عام طور پر دہشت گردی کو جدید نظریات کی براہ راست پیداوار تصور کیا جاتا تھا۔ تاہم اسلام پسند دہشت گردوں کا ادعا یہ ہے کہ وہ دینی جذبے کی بناء پر لڑتے ہیں۔ قرآن کی چند آیات اور سیرت رسولؐ کے چند حوالے ان کی ہر کارروائی پر اسلامی مہر ثبت کر دیتے ہیں۔ تمام کا تمام نظریاتی جامہ روایات، نسلیت اور نئے پرانے تاریخی قصوں کی پکار سے بُنا جاتا ہے۔ ساتھ ہی بڑی قوت والے مذہبی انداز کے حوالوں اور نعروں مثلاً ''کافر''، ''بت پرست''، ''صلیبی جنگجو''، ''شہداء''، ''مقدس جنگ''، ''پاک زمین''، ''دشمنانِ اسلام''، ''حزب اللہ'' اور ''شیطانِ اعظم'' کو استعمال کیا جاتا ہے۔

لیکن ان مذہبی اصطلاحات اور نعروں کی وجہ سے اسلام پسندی کی وہ حقیقی نوعیت پوشیدہ رہ جاتی ہے جو کہ روایتی اسلام اور جدید جمہوریت دونوں کے لیے جدید مطلق العنانیت کا ایک چیلنج بن گئی ہے۔ اگر دہشت گردی اسلامی ایمان و یقین کے اتنا ہی قریب ہے جیسا کہ اسلام پسند اور بہت سے ان کے دشمن

دعویٰ کرتے ہیں تو بین الاقوامی اسلام پسند دہشت گردی کا آغاز ۱۹۷۹ء سے ہی کیوں ہوا؟ اس سوال کی بڑی زوردار گونج بہت سے بلند پایہ اسلامی دانش وروں اور علماء کے بیانات میں پائی جاتی ہے جنہوں نے مسلسل اور یکساں طور پر اسلام پسندوں کی دہشت گردانہ کارروائیوں کی مذمت کی ہے۔

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اسلامی فقہ اور فلسفہ معاشرے کا ایک جمہوری منظر پیش کرتا ہے یا جمہوریت اور انسانی حقوق کے اصولوں کو آسانی سے اپنا لیتا ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ وہ اسلامی احکام کی رُو سے دہشت گردی کے جواز کی دھوکے بازی کو عیاں کر دیتا ہے۔ اسلام کی تاریخ میں القاعدہ یا حزب اللہ کی قطعاً بلا روک ٹوک متشدد کارروائیوں کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ حتیٰ کہ حشیشین نامی شیعہ اسمٰعیلی فرقے نے اگرچہ ایسے افراد کو استعمال کیا جو اپنے دشمنوں کو مارنے کے لیے خود مرنے کے لیے تیار تھے، وہ بھی اس پستی تک نہیں گیا کہ بے مقصد اور بڑے پیمانے پر قتل عام کر دے جیسا کہ حزب اللہ، اسامہ بن لادن اور ان کے حواری فخر کرتے ہیں۔

خود کو مار لینے اور ساتھ ہی بلا وجہ عورتوں، بچوں اور تمام مذاہب اور رنگ و نسل کے لوگوں کو قتل کر دینے کا اسلام سے کوئی واسطہ نہیں اور یہ بات سمجھنے کے لیے کسی کا فاضل عالم دین ہونا ضروری نہیں ہے۔ ہمیں یہ فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ مسلمان بھی ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں کام کر رہے تھے۔ درحقیقت موجودہ زمانے کی اسلام پسند دہشت گردی نمایاں طور پر ایک جدید طریقہ کار ہے اور اسلامی روایات اور اخلاقیات کے عین خلاف ہے۔

اسلام اور دہشت گردی کے درمیان کشیدگی کی ایک واضح مثال اس گفتگو سے ملتی ہے جو دو مسلمانوں کے درمیان ایک فرانسیسی عدالت کے کمرے میں ہوئی جہاں فواد علی صالح پر اس کے اس کردار کے بارے میں مقدمہ پیش تھا جو اس نے ۱۹۸۵ء-۱۹۸۶ء میں پیرس کو ہلا ڈالنے والے بم دھماکوں میں ادا کیا تھا۔ اس بمباری میں بُری طرح زخمی ہونے والے ایک شخص نے صالح سے کہا: ''میں ایک باعمل مسلمان ہوں'' --- کیا اللہ نے تمہیں کہا ہے کہ بچوں اور حاملہ عورتوں پر بم چلاؤ''۔ صالح کا جواب تھا: ''تم الجیریا کے رہنے والے ہو۔ یاد کرو ان (فرانسیسیوں) نے تمہارے آباء اجداد کے ساتھ کیا کیا تھا''۔ دہشت گردی کے عمل کو جب مذہبی بنیادوں پر چیلنج کیا گیا تو اس کے جواب میں اس نے قرآنی آیات نہیں

پڑھیں بلکہ غیر مذہبی قوم پرستانہ شکایات کا حوالہ دیا۔

صالح کے مقدمے کی کارروائی کا مطالعہ بڑا دلچسپ ہے۔ وہ ایک سنی مسلم اور اصلاً تیونس کا باشندہ تھا۔ ۱۹۸۰ء کے اوائل میں وہ ایران کے شیعی تعلیمی دینی مرکز ''قم'' میں ''تعلیم حاصل کرتا رہا۔ اس نے اسلحہ چلانے کی تربیت لیبیا اور الجیریا میں حاصل کی اور بارودی سامان ایران نواز حزب اللہ کے جنگجوؤں سے حاصل کیا۔ اپنے دفاع میں اس نے نہ صرف قرآن اور آیت اللہ خمینی کو شامل کیا بلکہ جون آف آرک کا ذکر بھی کیا -- جو کہ فرانس کے انتہائی دائیں بازو کے لیے ایک مثال تھی --- جس نے اپنے ملک کا دفاع ایک ظالم کے خلاف کیا۔ اس کے بعد اس نے جولیس ایوولا (Julius Evolva) (۱۸۹۸ء-۱۹۷۴ء) کی تصنیف ''جدید دنیا کے خلاف بغاوت'' (Revolt against the Modern World) سے طویل اقتباسات پیش کیے۔ اس اطالوی مصنف کا حوالہ اکثر یورپی دائیں بازو کے انتہا پسندوں کی طرف سے دیا جاتا ہے۔ یہ عجیب نظریاتی مرکب اس امر کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے کہ یہ تحقیق و تفتیش کی جائے کہ اسلام پسند دہشت گردی کی ذہنی اور نظریاتی بنیادیں کیا ہیں؟

اسلام ازم کا نسب نامہ

اسلامی یکجہتی کی تحریک (Pan-Islamic Movement) کا تصور انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں ابھرا جبکہ اسی دوران روایتی اسلامی طرز کی حکومتوں نے تیزی سے قومی حکومتوں (nation states) کی شکل اختیار کر لی۔ مصری مدرس حسن البنا (۱۹۰۶ء-۱۹۴۹ء) کی شخصیت تھی جس نے مطلق العنانیت کے نظریے کو اساسی ڈھانچہ فراہم کرنے میں اوروں سے بڑھ کر کام کیا۔ تربیت کے اعتبار سے البناء کوئی دینی عالم نہ تھے۔ مصری قومیت کے جذبے سے سرشار ہو کر موصوف نے ۱۹۲۸ء میں اخوان المسلمون کی بنیاد رکھی جس کا واضح ہدف مغربی اثرات کا سدباب کرنا تھا۔

۱۹۳۰ء کے اواخر میں نازی جرمنی نے مصری فوج کے انقلابی جونیئر افسران کے ساتھ رابطے قائم کر لیے تھے جن میں بہت سے افسران اخوان المسلمون سے قریب تھے۔ زیادہ عرصہ نہ گزرا کہ اخوان جس نے اپنا آغاز خیراتی اداروں، تنظیموں اور ثقافتی سرگرمیوں کے ذریعہ کیا تھا، نوجوانوں کی ایک ذیلی تنظیم قائم

کر لی جس کا مسلک اپنے لیڈر کی غیر مشروط اطاعت تھا اور ایک نیم عسکری تنظیم بھی تشکیل دی جس کے نعرے ''عمل، اطاعت اور سکوت'' میں اطالوی فاشسٹ موٹو (motto) ''یقین، اطاعت جنگ'' کی گونج تھی۔ البناء کے تصورات روایتی دینی علماء کے تصوارت سے مطابقت نہ رکھتے تھے۔ موصوف نے بہت پہلے ۱۹۴۳ء میں اپنے پیروکاروں کو خبردار کر دیا تھا کہ روایتی مذہبی ہیئت حاکمہ سے ''سخت ترین مخالفت'' کی توقع رکھیں۔

البناء نے فاشسٹوں سے اور ان کی پشت پر اس یورپین روایت سے جو کہ انقلابی تشدد کے ذریعے مفروضہ طور پر ''قلب ماہیت'' یا ''تزکیہ نفس'' کا دعویٰ کرتی تھی بہادرانہ موت (شہادت) کا تصور بطور سیاسی حربے کے اخذ کیا۔ اگرچہ مغرب میں آج چند ہی لوگوں کو یہ بات یاد ہوگی۔ یہ مشکل ہوگا کہ اس انتہا سے بڑھ کر کچھ بیان کیا جا سکے جس انتہا تک بیسویں صدی کے اوائل میں موت کی جمال آرائی، مسلح فوجوں کی ثناخوانی، شہادت کی پرستش اور ''عمل کی مشتہری'' میں یقین کیا جانے لگا تھا۔ اور جس نے دائیں بازو کے انتہاپسندوں اور بائیں بازو کے انتہا پسند بعض عناصر، دونوں کے اندر ایسا قومی مزاج پیدا کیا جو آزاد خیالی کا مخالف تھا۔ البناء کی پیروی میں آج کے اسلامسٹ جنگجو شہادت کا ایک دہشت گرد مسلک اختیار کرتے ہیں جس کا تعلق سنی یا شیعہ اسلام کی نسبت جارجز سوریل (Georges Sorel) کی تصنیف Reflexions sur La Violence سے زیادہ بنتا ہے۔

جنگ عظیم دوم میں اتحادیوں کی فتح، اوائل ۱۹۴۹ء میں البناء کی شہادت اور انقلاب مصر (۱۹۵۲ء-۱۹۵۴ء) کے بعد اخوان المسلمون کو ایک طرف لادین فوجی حکومت کی دشمنی اور دوسری طرف مصری کمیونسٹوں سے شدید نظریاتی مبارزت کا سامنا کرنا پڑا۔ اخوان کے ترجمان اعلیٰ اور اخوان اور کمیونسٹوں کے درمیان رابطے کا ذریعہ بننے والے سید قطب (۱۹۰۶ء-۱۹۶۶ء) نے وہ نظریاتی جواب مرتب کیا جس نے آج کی اسلام پسندی کی بنیادیں استوار کیں۔

قطب نہ صرف البناء کے بلکہ پاکستانی مصنف اور جماعت اسلامی پاکستان کے بانی سید ابوالاعلیٰ مودودی (۱۹۰۳ء-۱۹۷۹ء) کے بھی پیروکار تھے۔ جماعت اسلامی پاکستان کی ایک اہم سیاسی قوت ہے، اگرچہ یہ قابل لحاظ انتخابی تائید کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ مودودی کی طرف سے قوم پرستی کی مخالفت اسلام کے

سیاسی کردار میں ان کی دلچسپی پر منتج ہوئی۔ انہوں نے تمام قوم پرستی کو مسترد کر دیا اور اس کو کفر قرار دیا۔ مارکسی اصطلاحات کو کام میں لاتے ہوئے انہوں نے ایک اسلامی ''انقلابی ہراول دستے'' کے لیے جدوجہد کی وکالت کی جو بیک وقت مغرب اور روایتی اسلام دونوں کے مخالف تھا۔ ایسی سکہ بند مغربی اصطلاحات مثلاً ''انقلاب''، ''ریاست'' اور ''نظریہ'' کے ساتھ ''اسلامی'' کی صفت کا اضافہ کر دیا۔ اگرچہ مسلم مذہبی فضلاء کی جانب سے سخت مخالفت ہوئی، تاہم مودودی کے خیالات ''جدید'' اسلامسٹوں کی ایک پوری نسل پر اثرانداز ہوئے۔

اپنے دونوں پیشرووں کی طرح قطب نے بھی روایتی دینی تربیت حاصل نہیں کی تھی۔ سرکاری کالج برائے معلمین سے فاضل ہو کر ۱۹۴۸ء میں وہ تعلیم کے لیے امریکہ چلے گئے۔ کبھی وہ مصری قوم پرست تھے مگر ۱۹۵۰ء میں وطن واپسی پر جلد ہی وہ اخوان المسلمون میں شامل ہو گئے۔ سید قطب جدید سرمایہ دارانہ نظام اور نمائندہ جمہوریت پر مارکسی اور فاشسٹوں کی تنقید سے بخوبی واقف تھے اور انہوں نے اسلام پسندی کی جس قسم کو پروان چڑھایا اس میں اس کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔

سید قطب نے ایک ایسی یکجہت ریاست کا مطالبہ کیا جس پر واحد اسلامی پارٹی حکمران ہو۔ مودودی اور متعدد مطلق العنان حکمرانی کو پسند کرنے والے مغربیوں کی طرح موصوف نے خود اپنی سوسائٹی (یعنی ہم عصر مسلم حکومتوں) کو دشمن کے طور پر شناخت کیا جس کے ساتھ ایک نیک نہاد نظریاتی طور پر خود آگاہ، پیش قدم اقلیت کو ہر ممکن طریقے سے بشمول متشدد انقلاب جنگ کرنا چاہیے، حتیٰ کہ ایک نیا اور مکمل منصفانہ معاشرہ وجود میں آ سکے۔ ان کے نزدیک مثالی معاشرہ ایسا غیر طبقاتی معاشرہ تھا جہاں آزاد منش جمہوریتوں کے ''خود غرض فرد'' نہیں ہوں گے اور انسان کے ہاتھوں انسان کے استحصال کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس پر شریعت کے نفاذ کے ذریعے صرف اللہ کی حاکمیت ہوگی۔ یہ تھا اسلام پسندی کے لباس میں فی الحقیقت لینن ازم۔

جب صدر جمال عبدالناصر کی استبدادی حکومت نے ۱۹۵۴ء میں اخوان المسلمون کو تعذیب کا نشانہ بنایا اور جس کے دوران ۱۹۶۰ء میں سید قطب کو تختہ دار پر چڑھا دیا گیا تو بہت سے لوگ ترک وطن کر کے الجیریا، سعودی عرب، عراق، شام اور مراکش چلے گئے۔ وہاں سے انہوں نے اپنے انقلابی اسلام پسندی

کے نظریات کا پرچار شروع کیا، بشمول ان تنظیمی اور نظریاتی حربوں کے جو انہوں نے یورپی مطلق حکمرانی کے نظریات سے مستعار لیے تھے۔ یہ پرچار ایسے نیٹ ورک کے ذریعے کیا گیا جس کی رسائی متعدد مذہبی سکولوں اور یونیورسٹیوں تک ہوگئی۔ آج کے نوجوان اسلام پسند اخوان المسلمون کے سید قطب والے بازو کے براہ راست ذہنی اور روحانی وارث ہیں۔

ایرانی ربط

البناء اور اخوان المسلمون نے اسلام کے مختلف طبقات فکر کو ایک ایسے یکساں نیٹ ورک کے ساتھ منسلک کرنے کی وکالت کی تھی جو اُن میں یک جہتی کا باعث بنے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ایران، جو دنیا بھر کے اہل تشیع کا گھر ہے، میں اخوان کے اثرات، اگرچہ جزوری طور پر، ۱۹۴۵ء میں ہی تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ اس سال عراق سے گھر واپس آتے ہی ایک نوجوان ایرانی مذہبی پیشوا مسمی نواب صفوی نے ایک دہشت گرد گروپ تشکیل دیا جس نے ایران کے متعدد لادین دانش وروں اور سیاست دانوں کو قتل کر ڈالا۔ ۱۹۵۳ء میں صفوی نے اخوان کی دعوت پر مصر کا دورہ کیا اور اغلب ہے کہ سید قطب سے ملاقات کی۔ اگرچہ صفوی کے گروپ کو کچل ڈالا گیا تھا اور ۱۹۵۵ء میں وزیراعظم کے قتل کی ایک ناکام کوشش کے بعد صفوی کو جان سے ہاتھ دھونا پڑے تھے۔ اس کی تنظیم کے بہت سے سابق ارکان آیت اللہ خمینی (۱۹۰۰ء-۱۹۸۹ء) کے ساتھیوں میں نمایاں تھے جنہوں نے ۱۹۷۹ء کے اسلامی انقلاب کی منصوبہ بندی کی تھی۔

۱۹۶۲ء میں خود خمینی نے ایک سیاسی موقف اختیار کیا تھا اور دیگر آیت اللہ حضرات کے ساتھ مل کر شاہ کے ان منصوبوں کی مخالفت کی تھی جو اصلاح اراضی اور خواتین کے ووٹ کے حق کے بارے میں تھے۔ اس مقام پر خمینی انقلابی نہیں تھے بلکہ جدت پسندی سے خوف زدہ ایک رجعت پسند تھے اور خواہش مند تھے کہ دیندار طبقے کی مراعات کا دفاع کریں۔ جب ان کے پیروکاروں نے جون ۱۹۶۳ء میں ایک شہری شورش برپا کی تو خمینی کو گرفتار کر لیا گیا اور بعدازاں پہلے ترکی اور پھر عراق میں ملک بدر کر دیا گیا۔ ۱۹۷۰ء میں ایک موڑ آیا جب خمینی ان چند شیعہ مذہبی مقتدر لوگوں میں شامل ہوگئے جنہوں نے روایت پسندی سے مطلق العنانیت (totalitarianism) کے فلسفے کی طرف رجوع کر لیا۔ مودودی کی طرح انہوں نے

اسلامی ریاست کے قیام کے لیے انقلاب برپا کرنے کا مطالبہ کیا اور سید قطب سے متاثر ہو کر تمام لادینی حکومتوں کو مشرکانہ قرار دے دیا۔ ایران میں ان کے پیروکار اسلامی ثقافتی انجمنوں میں سرگرم تھے جو دیگر باتوں کے علاوہ قطب اور مودودی کے افکار کی تشہیر کرتے تھے۔ سید قطب کے نظریہ کے ذریعے خمینی کے شاگردوں نے اسلام پسند تحریک کے لیے اس ایک پوری نسل کو دوبارہ قابو کیا جو دنیا کی ایک فائق انقلابی ثقافت ——مارکسزم، لینن ازم—— کے زیر اثر تھی۔

اسلام پسند دہشت گردی کی تاریخ میں خمینی ایک بڑی شخصیت بن گئے کیوں کہ وہ اولین حقیقی بلند مرتبہ مذہبی شخصیت تھے جن کے ذریعے اس تحریک کو مذہبی سند حاصل ہوئی۔ ایرانی انقلاب سے پہلے باوجود اس کے کہ نوجوانوں پر اسلامزم کا بہت اثر تھا، لیکن اس کی حیثیت محض ایک مخالف نظریے کی تھی۔ سید قطب اور مودودی دینداری کے مدعی تھے جنھیں سنی علما نے مسترد کر دیا تھا۔ حتیٰ کہ اخوان المسلمون نے بھی سرکاری طور پر قطب کے افکار کو رد کر دیا تھا۔ خمینی نے ایک مقتدر مذہبی عالم کے طور پر جدید اسلام پسند مطلق العنانیت کو ایک مذہبی توقیر عطا کی جس سے یہ قطعاً عاری تھی۔

اقتدار حاصل ہوتے ہی خمینی جو پہلے زرعی اصلاحات اور خواتین کے ووٹ کے مخالف تھے، ''ترقی کے اصولوں کے حامی'' بن گئے، اور انہوں نے قومیانے، بے دخلیاں کرنے اور انقلابی پروپیگنڈا کرنے اور عوام کو متحرک کرنے کی مہمات کے لیے خواتین کو بھرتی کرنے کے وسیع و عریض پروگرام شروع کر دیے۔ ان کے عہد کی لیننی خصوصیات —— ان کی دہشت کی پالیسی، ان کے انقلابی ٹریبونل اور عسکری تنظیمیں، ان کی انتظامی چھنٹائی، ان کا ثقافتی انقلاب اور ان کا روس کے بارے میں ہمدردانہ رویہ —— نے ان کے ساتھی دینی علما کو برگشتہ کر دیا لیکن ان کو ایران کی ماسکو نواز کمیونسٹ پارٹی کی حمایت حاصل ہو گئی جس نے ۱۹۷۹ء سے ۱۹۸۳ء تک خود کو نئی دینی حکومت کی خدمت میں لگائے رکھا۔

خمینی کا انقلاب خالصتاً شیعی مظہر نہ تھا۔ یہ محض اتفاق نہیں تھا کہ اولین غیر ملکی شخصیتوں میں سے جو خمینی کو مبارک باد دینے کے لیے وہاں خود پہنچے، ایک سنی اسلام پسند مودودی بھی تھے[۱]۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا

۱۔ یہ درست نہیں ہے پاکستان کی تحریک اسلامی کی نمائندگی پروفیسر خورشید احمد اور مولانا خلیل حامدی نے کی تھی۔ مولانا مودودی اس وفد میں شامل نہیں تھے جو انقلاب کی کامیابی پر خصوصی پرواز سے ایران گیا تھا۔ (ادارہ)

تھا کہ ایک ایرانی ڈاک کے ٹکٹ پر قطب کا چہرہ تھا۔ خمینی کے جانشین علی خامنائی نے سید قطب کا فارسی ترجمہ کیا۔ ایک ''اسلامسٹ انٹرنیشنل'' وجود میں لانے میں خمینی کی اپنی دلچسپی تھی جو بعد میں اغوا شدہ قرآنی اصطلاح حزب اللہ (اللہ کی پارٹی) کے نام سے جانی گئی۔ یہ سب کچھ بہت پہلے اگست ۱۹۷۹ء میں ہی عیاں ہو چکا تھا۔

اسلام پسند ''قوامیت''

جیسا کہ ان روابط سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام پسندی ایک خود آگاہ مسلم یکجہتی (پان-مسلم) کا مظہر ہے۔ یہ وقت اور قوتِ کار کا ضیاع ہوگا اگر یہ کوشش کی جائے کہ اسلام پسند دہشت گرد گروپوں کا ایک دوسرے سے ان کے مبینہ اختلاف کی بنیاد پر امتیاز کیا جائے جو کہ روایتی مذہبی، نسلی یا سیاسی تقسیم کی بنیاد پر ہو سکتا ہے (شیعہ بمقابلہ سنی، اہل فارس بمقابلہ عرب وغیرہ وغیرہ)۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ خود اسلام پسند گروپوں کی نگاہ میں ان کی مشترکہ کوشش کہ مغرب پر وار کیا جائے اور ساتھ ہی مسلم دنیا پر کنٹرول حاصل کیا جائے سب سے زیادہ اہم ہے بہ نسبت اس کے کہ اس بات پر نظر ڈالی جائے کہ کیا چیز انہیں ایک دوسرے سے ''ممتاز'' یا جُدا کرتی ہے۔

لبنان میں قائم ایران کی حمایت یافتہ حزب اللہ کی مثال دیکھی جاسکتی ہے۔ اس کا ایرانی موسس خمینی کا فدا کار ماتحت تھا جس نے ایک نوجوان مصری اسلام پسند سے فیض حاصل کیا، جو تربیت کے اعتبار سے انجینئر تھا، نہ کہ کوئی دینی عالم۔ اور جس نے اس اصطلاح کو جواب تک ایک مذہبی اصطلاح تھی ایک سیاسی نوعیت دے دی۔ اس تنظیم کا قریب سے مطالعہ کرنے سے یہ انکشاف ہوتا ہے کہ اس کے بانیوں اور رہنماؤں کے نظریے پر مارکسزم اور لینن ازم کا کتنا زبردست اثر تھا۔ اس گروپ کے موجودہ لیڈر محمد حسین فضل اللہ نے، جو تشدد کے بارے میں مارکس اور نیطشے کے دلائل وافکار سے متاثر تھے، کھلے طور پر دہشت گردی کے طریقوں اور بائیں بازو کی تنظیموں کے ساتھ تزویری اتحاد کی وکالت کی ہے۔ حزب اللہ، اسلام پسند ''قوامیت'' کی ایک کامیاب تخلیق ہے۔ شیخ فضل اللہ کا بیان ہے: ''ہمیں (ایرانی) انقلاب کے رہنما اور انقلابیوں کی اطاعت وفرمانبرداری کا حلف اس طرح اٹھانا چاہیے جیسا خود خدا کا، کیوں کہ یہ انقلاب

خدا کی مرضی سے ہوا۔ اس فرماں برداری کی انتہا کی طرف ایک اشارہ یہ حقیقت ہے کہ لبنان میں گھرے ہوئے یرغمالیوں کے مقدر پر مذاکرات تہران کی طرف سے کیے جانے پر ختم ہوئے۔ اسی طرح ایران کے انقلابی محافظین کے سربراہ نے یہ شیخی بھگاری تھی کہ لبنان میں فرانسیسی اور امریکی امن افواج پر حملہ ان کی مدد سے کیا گیا تھا۔ حزب اللہ کا چیف عسکری منصوبہ ساز عماد مغانیہ ایک عرب ہے جو ایران سے کارروائی کرتا ہے۔ مغربی جاسوسی ایجنسیاں یہ شک کرتی ہیں کہ حزب اللہ اپنی بین الاقوامی کارروائیوں میں ۱۹۹۰ء کی دہائی سے بن لادن کے ساتھ کام کرتی رہی ہیں۔ حزب اللہ کا لبنان میں دہشت گردی کا نیٹ ورک سنی اور شیعہ دونوں گروپوں پر مشتمل ہے اور اس کا ایک بازو سعودی عرب میں بھی ہے جو الخُبر ٹاور پر بمباری میں ملوث تھا جس سے ۱۹۹۶ء میں ۱۹ امریکی فوجی مارے گئے تھے۔

ایرانی انقلاب سے ایک خود مختار سنی دہشت گرد گروہ بھی متاثر ہوا جو آگے چل کر القاعدہ کی بنیاد بن گیا۔ تہران حکومت نے ۱۹۸۲ء میں ہی سنی مذہبی علماء کی رائے کو متاثر کرنے کے لیے پروپیگنڈہ کے ہتھیاروں سے کام لینا شروع کر دیا تھا۔ جمعہ کے خطبہ کے اماموں کی عالمی کانگریس ان دیگر اداروں میں سے ایک تھی جو ورائے قوم قائم کیے گئے اور ایک وقت ایسا بھی آیا جب اس کانگریس میں ۴۰ ممالک سے علماء نے شرکت کی۔ ان کوششوں کا قومی ہدف یہ رہا تھا کہ مقتدر حلقوں کے رجعت پسند اسلام کے مقابلہ میں ''عوامی اسلام'' کو متحرک کرتے ہوئے آگے بڑھایا جائے۔ مختلف وجوہات کی بنا پر یہ نیٹ ورک ڈھیلے انداز میں منظم رہا تاہم اس کی تمام شاخیں اسی نظریاتی اصل جڑ سے پھوٹتی اور غذا لیتی رہیں۔

ایران کے اسلامسٹ انقلاب کے اثرات کا ذکر مصری اسلامی جہاد کے ان ممبران نے بھی کیا ہے جنہوں نے اکتوبر ۱۹۸۱ء میں صدر انور سادات کو گولی کا نشانہ بنایا تھا۔ ان کا نظریہ کار ایک انجینئر عبدالسلام فراج تھا جس کو دہشت گردی کا جواز پیش کرنے میں سید قطب کا حوالہ دینے کا شوق تھا۔ انور سادات کے قتل کی سازش کرنے والے، بشمول جونیر آرمی افسران جنہوں نے اصل گولی چلائی۔ ایرانی ماڈل سے جذبہ حاصل کر رہے تھے اور توقع کر رہے تھے کہ سادات کی موت سے ایک عوامی شورش بپا ہو گی اور قاہرہ میں بھی ان ہی جیسے واقعات کا اعادہ ہو گا جو کہ دو سال پیشتر تہران میں واقع ہو چکے تھے (جہاں کچھ عرصہ بعد ایرانی حکومت نے ایک سڑک کا نام سادات کے قاتل کے نام پر رکھ دیا تھا)۔ اس سازشی منصوبہ کے

شبہ میں جو لوگ گرفتار ہوئے ان میں قاہرہ کے ایک طبیب ایمن الظواہری تھے جو اپنی تین سالہ قید سے رہائی کے بعد جہاد کے لیڈر بن گئے، ۱۹۸۵ء میں بن لادن سے ملاقات کی اور ۱۹۹۰ء کے عشرے میں سوڈان جا کر ان کے ساتھ کام شروع کر دیا۔ الظواہری نے، جو القاعدہ کے سرکردہ لیڈروں میں ہیں، عوام میں یہ کہا کہ اسامہ ''نیا چی گویرا'' ہے۔

مسئلہ فلسطین کو اسلامی رنگ دینے کی جزوی وجہ اسلامی جہاد کی فلسطینی شاخ پر خمینی کا اثر انداز ہونا ہے۔ اس کا بانی ایک اور طبیب تھا جس کا نام فتحی شقیقی تھا۔ موصوف کی تصنیف: ''خمینی: اسلامی متبادل (Khomeini: The Islamic Alternative, 1997) کا انتساب ایرانی سربراہ مملکت اور حسن البناء کے لیے تھا (''اس صدی کی دو شخصیتیں'')۔ کتاب کی پہلی اشاعت کے دس ہزار نسخے محض چند دنوں میں فروخت ہو گئے۔ شقیقی اگرچہ خود سنی تھے تاہم وہ تہران گئے اور علی خامنائی کے جمعہ کے خطبہ کی محفل میں شریک ہوئے، مشرق وسطیٰ کے امن کی کارروائی کو مسترد کر دیا اور یاسر عرفات کو غدار ٹھہرایا۔

اسلامی تاریخ اور تعلیمات کو مسخ کرنا

جیسا کہ ان مثالوں سے ظاہر ہے ان دہشت گرد گروپوں کے درمیان امتیازات اگر ہیں بھی تو ان پر ان گروپوں کی چند مشترک نظریاتی اعتقادات کے تحت اشتراک کے لیے آمادگی غالب آ جاتی ہے۔ ان اعتقادات کو بجا طور پر ''اسلامی'' کہنے کے بجائے ''اسلامسٹ'' یا ''اسلام پسند'' کہا جاتا ہے کیونکہ یہ حقیقی طور پر اسلام سے متصادم ہیں۔ ہمیں اس بات کی اجازت نہیں دینی چاہیے کہ ان گروپوں کی طرف سے بعض اسلامی اصطلاحات کے استعمال کی بناء پر ان کے نظریات کو اسلامی سمجھا جائے۔ اس کی ایک مثال ان اسلام پسندوں کی طرف سے ہجرتِ مدینہ کی تعبیر ہے۔ یہ ہجرت حضرت محمد [صلی اللہ علیہ وسلم] نے ستمبر ۶۲۲ء میں اس لیے کی تھی کہ ایک مکمل اور خود مختار اسلامی امت کی داغ بیل ڈال سکیں۔ بہت سے تاریخی اور دستاویزی حقائق کے برعکس نیم تعلیم یافتہ اسلام پسند اصرار کرتے ہیں کہ یہ ہجرت موجودہ معاشرے سے انقلابی علیحدگی کی غمازی کرتی ہے اور انہیں اس سے اس خواہش کا جواز حاصل ہو جاتا ہے کہ اپنے انتہا پسند خیالی تصور کی تکمیل کے لیے ہم عصر مسلم معاشروں کو لادین قرار دے کر ان کے خلاف کارروائیاں

کریں۔

ایران کی اسلامی جمہوری حکومت بھی اسی طرح کے غیر راسخ آزاد خیال نظریے پر قائم ہے۔ خمینی نے ایک واحد مقتدر اسلامی فقہ کے مطلق اختیار کا عجیب وغریب نظریہ دیا ہے۔ یہ محض اتفاق نہ تھا کہ خمینی حکومت کے خلاف اولین شورشیں ایک سرکردہ آیت اللہ شریعت مداری کی تحریک پر برپا ہوئیں۔ حکومت کے کارپردازوں نے یہ تسلیم کیا ہے کہ اکثر ایرانی دینی رہنماؤں نے ہمیشہ خمینی ازم پر محتاط نظر رکھی ہے۔ یہ سمجھنا بہت اہم ہے کہ وہ مذہبی حوالے جس سے خمینی اپنے اقدار کا جواز پیش کرتے تھے وہ لفظاً وہی تھے جنہیں ایک صدی قبل ایک معروف آیت اللہ نے پارلیمانی نظام اور مقبول خودمختاری کی اسلامی اساس واضح کرنے کے لیے پیش کیا تھا۔ قرآنی آیات کی بہت سی مختلف بلکہ متضاد تاویلات کی جاتی ہیں۔ لہٰذا ہمیں اسلامی مذہبی وسائل کے علاوہ کچھ اور چیزوں پر نظر ڈالنی ہوگی۔ اگر ہم یہ سمجھنا چاہیں کہ اسلامزم کیا ہے اور وہ جنگ کیا ہے، جو وہ اپنے ہی معاشرہ کے خلاف کرتا ہے؟ ایسی جنگ جس میں بین الاقوامی دہشت گردی تو صرف اس کا ایک محاذ ہے۔

۱۹۹۸ء میں امریکہ کے خلاف بن لادن کے اعلان جہاد پر ایک مختصر مضمون میں برنارڈ لیوس نے واضح طور پر بتایا تھا کہ بن لادن نے کس طرح نہ صرف حقائق کو مثلاً سعودی عرب میں دعوت پر بلائی گئی امریکی موجودگی کو ایک ''صلیبی جنگ'' کا حملہ قرار دینا) بلکہ اسلامی اصول کو بھی (جب اس نے مسلمانوں کو ترغیب دی کہ تمام امریکی شہریوں کو دنیا بھر میں جہاں کہیں بھی وہ پائے جائیں بلاامتیاز ذبح کر دیا جائے۔) توڑ مروڑ کر پیش کیا۔ لیوس نے اپنے قارئین کو یہ یاد دلاتے ہوئے کہ اسلامی شریعت جہاد کو اس کے سوا کچھ نہیں گردانتی کہ یہ ایک مستقل باقاعدہ جنگ ہے اور ان قواعد کے تحت ہے جو اس نوعیت کے تنازعات کو محدود کرتے ہیں۔ برنارڈ لیوس نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ''اسلام کا بنیادی متن کہیں بھی دہشت گردی اور قتل کی اجازت نہیں دیتا اور کہیں بھی یہ نہیں کہا گیا ہے کہ غیر متعلقہ تماشائیوں کو بے دریغ قتل کر دیا جائے''۔

جہاد کا دہشت گرد واہمہ جس کو ایرانیوں نے تخلیق کیا اور بعدازاں بن لادن نے اختیار کیا اس کو قرآنی اساس سے کوئی تقویت نہیں ملتی۔ قطعاً نہیں، بلکہ اس کے برعکس یہ دہشت گرد کارروائیوں کی

وحشیانہ کامیابی ہے جس نے ان کے نظریے کو طاقت بخش دی ہے۔ بن لادن نے ایرانی مدد سے کی گئی اس ٹرک بمباری کی خصوصی تحسین کی جس میں ۲۴۱ امریکی فوجی دوسروں کے ساتھ ۲۳ اکتوبر ۱۹۸۳ء کو بیروت میں مارے گئے تھے اور جس سے امریکیوں کے لبنان سے اخراج میں تیزی آئی۔

بین الاقوامی دہشت گردی کے لیے تربیتی کیمپ قائم کرنے کا خیال پہلی مرتبہ بن لادن کو نہیں آیا، بلکہ اس سے پہلے ایرانی حکام یہ کام کر چکے تھے۔

۱۹۸۹ء میں ان مقتدر ہستیوں میں سے ایک علی اکبر ہاشمی رفسنجانی نے جو اس وقت اسلامی پارلیمنٹ کے صدر تھے، اپنے ایک خطبہ جمعہ میں جو کچھ فرمایا اس سے اسلام پسند دہشت گردی کی منطق کسی اور ذریعہ کی نسبت زیادہ بہتر طور پر ظاہر ہوتی ہے۔ اسرائیل کے وجود کو اسلام کے خلاف کفر کی ایک نفوذ پا جانے والی جنگ کا ایک اور محاذ قرار دیتے ہوئے رفسنجانی نے فرمایا:

''اگر آج فلسطین میں ہر فلسطینی کے بدلے پانچ امریکی، انگریز یا فرانسیسی مارے جائیں تو وہ ایسی حرکتیں دوبارہ نہیں کریں گے،--- امریکی دنیا بھر میں موجود ہیں--- وہ اسرائیل کا تحفظ کرتے ہیں۔ کیا ان کے خون کے کوئی قیمت ہے؟ انہیں فلسطین سے باہر خوفزدہ کر دو تاکہ وہ خود کو [کہیں] محفوظ نہ سمجھیں-- ایک ملک میں ایک لاکھ فلسطینی موجود ہیں، وہ تعلیم یافتہ ہیں اور وہ کام کرتے ہیں--- وہ فیکٹریاں جو فلسطین کے دشمنوں کی خدمت کرتی ہیں فلسطینیوں کے کام کی بدولت چل رہی ہیں۔ اس فیکٹری کو اڑا دو، جہاں تم کام کرتے ہو وہاں کارروائی کر سکتے ہو--- تمہیں وہ دہشت گرد کہتے ہیں تو کہنے دو--- یہ لوگ (اطلاعات اور پروپیگنڈا کی سامراجیت کے ذریعے) جرائم کرتے ہیں اور ان کو انسانی حقوق گردانتے ہیں۔ ہم اس کو حقوق کا دفاع اور وہ بھی مظلوم عوام کا دفاع کہتے ہیں--- یہ لوگ کہیں گے کہ پارلیمنٹ کا صدر دہشت گردی پر اکساتا ہے--- ان کو کہنے دو''۔

یہاں مذہب کا کوئی حوالہ نہیں ہے۔ رفسنجانی کی یہ اپیل خالصتاً سیاسی ہے۔ مغرب کے جرم کو موصوف نے انسانی حقوق کہا، اس کے خلاف موصوف مسلمانوں پر زور دیتے ہیں کہ دہشت گردی کرنا مظلوم لوگوں کے حقوق کے دفاع کے لیے بہترین ہتھیار ہے۔ علاوہ ازیں رفسنجانی نے نام لے کر دہشت

گردی (Terror) کی تحسین کی، اور اس میں انگریزی کا لفظ استعمال کیا نہ کہ اس کا فارسی یا عربی متبادل۔ اس طرح موصوف وہی اصطلاح استعمال کرتے ہیں جو لینن نے فرانسیسی انقلاب کی اصلاح (la terreur) سے مستعار لی تھی۔ اس طرح گلوٹین اور چیکا (Cheka) (فرانسیسی انقلاب میں استعمال کردہ قتل اور اذیت کے ہتھیار) سے خودکش بمباری تک واضح خط موجود ہے۔

اس کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہم ایک لمحے کے لیے اس وقت کے انقلاب فرانس پر نظر ڈالیں جب سیاسی دہشت گردی کا جدید تصور ایجاد کیا گیا۔ اسلامی روایت سے اس کی کوئی وضاحت نہیں مل سکتی۔ ستمبر ۱۷۹۳ء میں جب انقلاب فرانس کی دہشت کی پالیسی کا اعلان کیا گیا تو اس وقت ''پارسا اقلیت'' جو اس وقت کی فرانس کی انقلابی حکومت چلا رہی تھی، اپنے ہی معاشرے کے خلاف جنگ کا اعلان کر رہی تھی۔ اس جنگ کی تہہ میں دو گروہوں کے درمیان یہ اختلاف بہت واضح ہے کہ وہ ''عوام'' کون ہیں جن کے نام پر یہ حکومت اقتدار کا دعویٰ کرتی تھی۔ ان میں سے ایک گروپ ان ۲۵ ملین افراد کا تھا جو فی الحقیقت موجود تھے اور جن میں سے ہر شخص فطری حقوق رکھتا تھا۔ دوسرا گروپ وہ تھا جو لازمی نظریاتی ساخت پر پیدا کیا گیا تھا، جو ایک مجرد، ناقابل تقسیم اور پر اثر وجود رکھتا تھا اور جس کی طاقت لامحدود تھی۔ انقلاب فرانس کی دہشت (The Terror of the French Revolution) کوئی غلطی نہیں تھی، نہ یہ کوئی بدقسمت حادثہ تھا۔ اس کا مقصد اس پراسرار وجود کی تطہیر تھا جسے دہشت گردوں کا اعلیٰ طبقہ فاسد اثرات گردانتا تھا۔ ان ہی میں سے انہوں نے اس خیال کا تعین کیا کہ انفرادی طور پر انسان ناقابل انتقال حقوق کا مالک تھا۔

اسلام پسند انقلاب کے نقیبوں کی آواز میں جیکو بن فرانس (Jacobin France) کی گونج سنائی دیتی ہے۔ انسانی حقوق کی پامالی وہ مقام ہے جہاں مسلم معاشرہ میں اندرونی جنگ کے ڈانڈے مغرب کے خلاف دہشت گردی کی جنگ سے جا ملتے ہیں۔ اس ضمن میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تباہی پر بن لادن کا تبصرہ سن لینا ہی کافی ہوگا: ''وہ ہیبت ناک علامتی ٹاور جو آزادی، انسانی حقوق اور انسانیت کی بات کرتے ہیں، تباہ کر دیے گئے ہیں۔ وہ اب دھوئیں کی نذر ہو گئے ہیں''۔ مغرب والوں کے خلاف ہر اسلام پسند دہشت گرد مہم کا صلبی تعلق گزشتہ بیس سال کے دوران کسی نہ کسی اسلام پسند تحریک سے رہا ہے، جس سے دنیا میں کسی نہ کسی جگہ مسلم آبادی پر ظلم کیا گیا۔ اس مصیبت کو دیکھیے جو طالبان اور القاعدہ افغانستان کے لوگوں پر

ڈھاتی ہے یا الجیریا کے عام لوگوں نے ۱۹۹۰ء کی وحشیانہ اسلامسٹ خانہ جنگیوں سے جو تکلیفیں اٹھائی ہیں۔ اس ریاستی دہشت گردی کا خیال کریں جو ایران میں انسانی حقوق کو تسلیم کیے جانے کی ہر امید کا گلا گھونٹ ڈالنے کے لیے روزانہ کی جارہی ہے۔ مغرب کے خلاف دہشت گردی اور مسلمانوں پر ظلم کے درمیان باہمی تعلق کا پوری طرح پتہ لگانے کے لیے ایک علیحدہ مضمون درکار ہوگا۔ ہم اس کی نوعیت کا ایک اندازہ امریکہ کے خلاف اسلام پسند دہشت گردی کی پہلی مثال سے لگا سکتے ہیں جب ۱۹۷۹ء میں تہران میں [امریکی ایمبیسی کو] یرغمال بنانے کا واقعہ پیش آیا۔

دہشت گردی کی یرغمال جمہوریت

تہران کے حکام نے جنوری ۱۹۸۱ء میں جب یرغمالیوں کو رہا کیا تو انہوں نے اپنی فتح پر بڑی کائیں کائیں کی جس کو اس وقت کے وزیراعظم محمد علی رجائی نے ''دنیا کی سماجی تاریخ میں سب سے بڑا سیاسی معرکہ'' قرار دیا، نیز ایک ایسا عمل جس نے سب سے بڑی شیطانی قوت کو گھٹنوں کے بل گرادیا''۔ پہلی نظر میں تو یہ دعویٰ بے وقوفانہ معلوم ہوسکتا ہے کیونکہ امریکہ نے انقلابی حکومت کے مطالبات، کہ شاہ کو ان کے سپرد کیا جائے اور ایرانی اثاثوں کو واگذار کیا جائے، کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔لیکن اس پر عمیق نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ فی الحقیقت ایرانی اسلام پسندوں نے ایک بڑی سیاسی اور نظریاتی فتح امریکہ پر اور اپنے ملکی مخالفین پر حاصل کی تھی۔اور اس طرح ان کے لیے خوشیاں منانے کا بڑا واضح جواز موجود تھا۔

امریکی سفارت خانے پر قبضے کا واقعہ ایسے وقت میں پیش آیا جب کہ خمینی اور ان کے اتحادی اپنی ظالمانہ حکومت کو مستحکم نہ کر پائے تھے۔ ماہرین کی ایک کمیٹی اسلامی جمہوریہ کے دستور کا مسودہ تیار کر رہی تھی۔حزب اختلاف، دینی طبقوں اور معتدل حلقوں دونوں میں دن بدن قوت پکڑ رہی تھی۔ مارکس اور لینن کا پیروکار بایاں بازو، جو اپنے پریس پر پابندی کی وجہ سے ناراض تھا، اب بے چین ہو رہا تھا۔حساس سرحدی علاقوں میں جہاں کرد اور آزری آبادی تھی، کھلی بغاوت پھوٹ رہی تھی۔اپنے انتہا پسند طلبا کے نوجوان طبقے کو بھیج کر امریکی سفارت خانے پر قبضہ کر لینے اور اس کے عملے کو یرغمال بنا لینے سے حکومت

نے ایک ہی وار میں ان چیلنجوں کی مصیبت سے نجات حاصل کر لی اور ساتھ ہی دستور پر ہر طرف سے کی جانے والی تنقید کا زور توڑ دیا۔ اس بارے میں رفسنجانی کا تجزیہ، کہ اس عمل کا کیا مطلب تھا، سبق آموز ہے:

> انقلاب کے اولین مہینوں میں، واشنگٹن وہائٹ ہاؤس نے ایران میں تختہ پلٹائے جانے کی حمایت کی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ وہ ایرانی گروپوں میں سرایت کر لیں گے اور انقلاب کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں گے، لیکن امریکی سفارت خانے پر قبضے اور امریکہ کے خلاف عوامی حملوں نے اس منصوبے کو ناکارہ کر دیا۔

حقائق کا اس طرح سے بیان کیا جانا گویا مضحکہ خیز ہے۔ ۱۹۷۹ء میں امریکی حکومت کا نہ تو یہ عزم تھا نہ ہی یہ صلاحیت تھی کہ اسلامی جمہوریہ کے خلاف تختہ پلٹا دینے والی کارروائی کر سکے۔ لیکن مطلق العنان لوگ اپنی ایک مخصوص پراسرار زبان استعمال کرتے ہیں جو وہ خود ہی وضع کرتے ہیں۔ جن لوگوں نے انقلابی فرانس میں دہشت گردی کا اہتمام کیا انہوں نے اپنے ملک کے مشہور و معروف جمہوریت نواز لوگوں پر ''شاہ پرست'' (monorchist) کا ٹھپہ لگا کر انہیں تختہ دار تک پہنچا دیا۔ بالشویکیوں نے مخالف ملاحوں اور ہڑتالی مزدوروں کو ذبح کر دینے سے پیشتر انہیں ''ڈاکو'' اور ''انقلاب دشمن'' قرار دیا۔ ۱۹۷۹ء میں امریکہ اپنی خارجہ پالیسی میں انسانی حقوق کے فروغ کو نمایاں کر کے بیان کرتا تھا۔ لہٰذا رفسنجانی کی منطق کے مطابق جو ایرانی گروپ انسانی حقوق کی بات کرتا تھا وہ گویا خود کو اس لحاظ سے امریکہ کے آلہ کار کے طور پر ظاہر کر رہا تھا۔

فی الحقیقت یرغمالیوں پر جب بے ربط مذاکرات نے طول پکڑا تو صدر جمی کارٹر کی انتظامیہ نے ایران میں جمہوریت کی تائید میں بات کرنی ترک کر دی۔ حالانکہ جمہوریت ہی وہ مقصد تھا جس کی خاطر کارٹر نے شاہ کی مدد ختم کرنے کا خطرہ مول لیا تھا۔ اس اثناء میں انقلابی حکمرانوں نے سٹالن والا حربہ استعمال کرتے ہوئے یہ دعویٰ کیا کہ جو کوئی بھی زیادہ نمائندہ حکومت کی بات کرتا ہے وہ فی الحقیقت امریکی ایجنٹ ہے۔ یرغمالی بحران کے ساتھ ساتھ اسلامسٹ حکمرانوں نے امریکیت کی مخالفت کو ایک ایسا اہم موضوع بنا ڈالا کہ مارکس کے ایرانی پیروکار بھی اس کی تائید میں اٹھ کھڑے ہوئے جب کہ ماسکو نے بھی نئی مذہبی حکومت کو اپنا خفیہ تحفظ فراہم کیا۔

امریکی فوج نے ۲۵ اپریل ۱۹۸۰ء کو جو کوشش یرغمالیوں کو بچا لے جانے کی ''ڈیزرٹ ون'' (Desert-one) کے نام سے کی تھی اس میں ناکامی کے بعد اور مزید آٹھ ماہ تک مذاکرات سے امریکہ آخرکار اس بارے میں کامیاب ہوا کہ اپنے یرغمالیوں کو رہا کرالے۔ اس کے لیے اس کو آمادہ ہونا پڑا کہ وہ ایرانی انقلابی حکومت کے جواز کو تسلیم کر لے گا۔ اس کو یہ وعدہ بھی کرنا پڑا کہ وہ بین الاقوامی مقتدر اداروں کے پاس ایران کے خلاف شکایت لے کر نہیں جائے گا، باوجود اس کے کہ انسانی حقوق اور بین الاقوامی قانون کی وافر خلاف ورزیاں ہو چکی تھیں۔ اگرچہ یہ رعایتیں اس وقت ناگزیر معلوم ہوتی ہوں گی تاہم گذشتہ واقعات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اسلامسٹ قوتوں کو زیادہ دلیر کر دیا جس سے وہ مغرب کے بارے میں نفرت اور حقارت اور انسانی حقوق سے متعلق گفتگو میں پستیوں کی نئی سطح تک جا پہنچے۔ پھر کیا یہ واقعہ نہیں کہ تہران کے انقلابی طلبا اور دینی رہنماؤں نے ''شیطان بزرگ'' کو اپنے اصول ترک کر دینے پر مجبور کر دیا تھا اور اس کو گھٹنوں پر لے آئے تھے؟

دہشت گردوں نے صحیح تخمینہ لگا لیا تھا کہ ان کی فتح کی انتہا کہاں تک ہے اور اس سے نتائج بھی اخذ کر لیے تھے۔ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے انہوں نے دہشت گردی سے کام لیا۔ اب ان کی بقا کا انحصار ہی دہشت گردی پر ہے۔ ''(امریکہ) اب مدافعت پر مجبور ہے۔ اگر کل وہ خود کو محفوظ سمجھنے لگے تو پھر وہ اپنے سامراجی منصوبوں پر عمل درآمد کے بارے میں سوچنے لگے گا''۔ ان کے پراجیکٹوں میں سے ایک انسانی حقوق ہے جسے اسلامی جمہوریہ کے ایک نمائندے نے اقوام متحدہ کی انسانی حقوق کمیٹی کے سامنے رد کرتے ہوئے ''سامراجی خیالی منصوبہ'' قرار دیا تھا۔

۱۹۷۹ء میں تہران میں یرغمالی بنا لینے کے وقت سے لے کر گزشتہ ستمبر کے دہشت گرد حملوں تک مغربی پالیسی سازوں نے اکثر و بیشتر مضمر طور پر انصاف کے تقاضوں کو پس پشت ڈالا اور دہشت گردوں کا پرعزم تعاقب کرنے سے انکار کر کے نہ صرف اپنے ہی شہریوں سے انصاف نہ کیا بلکہ انسانی حقوق کے مقصد کے بارے میں اپنا فرض ادا کرنے سے پہلو تہی کی۔ ''عملیت'' اور ''دانائی'' جیسی اصطلاحات کو انصاف کی نیلامی لگانے کے جواز کے طور پر پیش کیا گیا جس نے انتہائی ظالمانہ طعن و استہزا کی ایک صورت میں جو یہاں ستمبر کی خیرہ کن روشنی کے ساتھ سامنے آئی، یہ ثابت کر دیا کہ یہ اقدام ہرگز 'دانائی' پر

مبنی نہ تھا۔

جب سے تہران میں یرغمال بنانے والوں کو سزا سے مامون کیا گیا۔ دہشت گردی کے حملے اپنی تعداد، تکرار اور شدت کے لحاظ سے بڑھتے چلے گئے۔ سلامتی کے انتظامات اور سراغ رسانی کی ناکامیوں، خارجہ پالیسی میں فیصلہ سازی کے بارے میں جواب دہی وغیرہ جیسے معاملات پر اٹھائے گئے تمام سوالات کے علاوہ گیارہ ستمبر کی سفاکی بھی جمہوری ملکوں کے شہریوں کو مجبور کرتی ہے کہ وہ خود سے یہ سوال کریں کہ انہوں نے جمہوری قدروں کی کہاں تک پاسداری کی ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ ان کے دشمن ایک خوف ناک غیر حقیقی خیالی تخلیق میں یقین رکھتے ہوں لیکن یہی وہ چیز ہے جس کے لیے انہوں نے یہ دکھا دیا ہے کہ وہ جان دینے کے لیے پوری طرح تیار ہیں۔ دہشت گردوں کی ''قربانیوں'' کے تناظر میں آزاد دنیا کے شہریوں پر لازم آتا ہے کہ وہ اپنے ضمیروں کو ٹٹولیں، ان کو چاہیے کہ وہ موجودہ ناتوان اور ناپختہ جمہوریت سے اپنی وفاداری کی نوعیت کا نئے سرے سے جائزہ لیں۔ بالخصوص وہ مضبوط یگانگت کے تانے بانے جو مطلق العنان اسلام پسند نے تخلیق کر لیے ہیں اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ جمہوری معاشرے اس سوال کو اٹھائیں کہ ان کی حکومتوں نے ان جمہوریت نواز سرگرم کارکنوں کی کہاں تک مدد کی جو سالہا سال تک ایران، الجیریا، افغانستان، سوڈان اور دیگر ممالک میں ظلم کا شکار ہوتے رہے۔ یہ غیر مسلح لوگ دہشت گردی اور ظلم کے خلاف جدوجہد کے اولیں محاذ پر کھڑے ہیں۔ یہ مدد کے مستحق ہیں اور یہ ہے وہ اخلاقی، سیاسی بلکہ فلسفیانہ چیلنج جس پر مغرب کے دل و دماغ کو توجہ مرکوز کرنی چاہیے۔

مسلم دنیا کدھر ہے؟

اسلام پسند دہشت ایک مختلف مسئلہ پیش کرتی ہے جو ہم میں سے ان لوگوں (بشمول مصنفین مقالہ) کے لیے بھی کم سنگین نہیں ہے جو مسلمان ملکوں سے آئے ہیں اور یہ مسلم دانش وروں کے لیے بھی خصوصی چیلنج کا حامل ہے۔ عالم اسلام کی رائے عامہ نے بیشتر مگر اغلباً غیر ضروری خاموشی سے گیارہ ستمبر کے قتل عام کی مذمت کی ہے۔ ایران میں نوجوان لوگ گرفتاریوں اور پولیس کی زیادتیوں کا مقابلہ کرتے ہوئے والہانہ گلی گلی امنڈ آئے تاکہ مظلوموں کی یاد میں شمعیں جلائی جاسکیں۔ لیکن چند مسلمان ملکوں میں تو شادیانے

بجائے گئے۔ اور پاکستان میں امریکہ مخالف مظاہرے کافی بڑے پیمانے پر ہوئے۔ غالبًا یہ بات مزید پریشان کن رہی ہے کہ مسلم معاشروں میں مسلسل اور عام افواہیں پھیل گئیں کہ اس حملہ کی پشت پر کسی نہ کسی طور سے اسرائیلی سازش کام کر رہی تھی۔ اس افواہ کا دباؤ اور پھیلاؤ ایک مجموعی فرار کی علامات ہیں، اس حقیقت سے، جواب بے قابو ہو چکی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ مسئلہ فلسطین ایک دردناک اور پیچیدہ مسئلہ ہے اور اس کے ایک عادلانہ حل کی ضرورت ہے۔ لیکن اس بات میں بھی اتنی ہی صداقت ہے کہ مسلم ممالک میں سے ہم بہت سوں کے لیے اپنی ذمہ داری سے بچنے کا ایک آسان طریقہ یہ بن گیا ہے کہ ہم غیر ملکی سازشوں تک رسائی کر لیں۔

عالم اسلام گذشتہ کئی صدیوں سے مغرب کے ساتھ ایک تکلیف دہ مجادلہ (encounter) سے گزرتا رہا ہے جب سے یہ مجادلہ شروع ہوا ہماری تاریخ ایک قابل واپسی جدیدیت کی کہانی بن گئی ہے۔ یہی نہیں بلکہ ایک طرف کامل تسلط اور دوسری جانب ذلت اور نفرت کا قصہ بن گئی ہے۔ مسلمانوں کے ذہن میں مغرب اور اس کے طور طریق ایک طاقت ور فسوں بن گئے ہیں —— نقصان رساں، ناقابل نفوذ اور ناقابل ادراک —— مغربی دنیا کی مسلمانوں سے جو بھی بدسلوکی رہی ہو یہ حقیقت ہے کہ مغربی دانش وروں نے کم از کم یہ کوشش کی ہے کہ وہ عالم اسلام کے بارے میں علم حاصل کریں اور اس کو سمجھیں۔ لیکن یہ افسوس ناک ہے کہ مغرب کے ''مستشرقین'' نے جو بڑی بڑی اور تابندہ تصانیف پیش کیں ان کی گونج بھی مسلمانوں کے دبستانِ ''مستغربین'' میں سنائی نہیں دیتی۔

ہم اس صلاحیت یا ارادے سے محروم رہے کہ ایک دوسرے سے بے تکلفانہ گھل مل جائیں۔ ہم نے ایک آسان حل اختیار کیا کہ اسلام کے درآمد شدہ مغربی ذہنی تصورات اور منطقی مقولوں کے لباس پہن کر اپنا بھیس بدل ڈالا۔ ایسا کرتے ہوئے ہم نے نہ صرف مغرب کو سمجھنے کا موقعہ گنوا دیا بلکہ ہم نے اپنی ثقافت کی کنجیاں کھو دیں۔ ورنہ یہ کیسے ہوتا کہ خستہ وخوار لینن ازم آج خود کو ایک عظیم توحیدی مذہب کے حقیقی اظہار کے ذریعہ کے طور پر پیش کر سکے؟ اسلام پسند خود کو جدیدیت اور مغرب کے خلاف دلیر جنگجوؤں کے طور پر گمان کرتے ہیں لیکن فی الحقیقت انہوں نے خود مغرب سے کچھ ایسے انتہائی مبہم تصورات درآمد کر لیے اور پھر ان کو اسلامی الفاظ واصطلاحات کا رنگ دے دیا جو کبھی جدید مغرب میں

وجود میں آئے تھے۔ یہ ہیں وہ تصورات جن کو، بہت کچھ قتل و غارت گری کے بعد، اب مغرب نے بھی عموماً مسترد کر دیا ہے۔ اگر ہم خود اپنے ثقافتی ورثہ سے اتنے روگرداں نہ ہو جاتے تو ہمارے دینی رہنما اور دانش وراسلام پسندی اور اسلام کی حقیقی تعلیمات کے درمیان تضاد کو واضح کرنے کا کام بہتر طور پر انجام دے سکتے تھے۔ یہ لوگ زیادہ موثر انداز میں دہشت گردوں کے اس دعوے کو باطل کر دیتے کہ صرف وہ زمین پر اللہ کے قریبی اور بلاشرکت غیرے نمائندے ہیں خواہ وہ اس عقیدے کا پرچار کر رہے ہوں جس کے تحت انسانی قربانی کے احیا کے علاوہ کچھ اور چارہ نہیں۔ گویا کہ اللہ نے فرشتہ بھیج کر حضرت ابراہیمؑ کو اپنے بیٹے کی قربانی سے روک نہیں دیا تھا۔

حقیقت کے ادراک میں ہماری کوتاہی کا اصل منبع ہمارا ذہنی خلجان ہی ہے۔ اگر ہم مغرب پر ایک واضح اور محتاط نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ وہ اپنی قوت، اپنی خودنگری اور بے لچک خود احتسابی سے حاصل کرتے ہیں۔ ہمیں پتہ چلے گا کہ مغربی ثقافت نے، ایک اجنبی شکل میں، اپنی طرف ہماری توجہ مبذول کرانے میں کبھی کوتاہی نہیں تا کہ اسے خود کو سمجھنے میں مدد دیں اور اس کی برائیوں سے جنگ کریں۔ جب اسے کوئی دوسرا نہ مل سکا تو اس نے خود اس کو تخلیق کر لیا۔ ٹامس مور نے ایک دور دراز خیالی جزیرے کا تصور اختیار کیا جس کو یوٹوپیا (Utopia) کہا جاتا ہے۔ اس میں اس نے اپنے زمانے کے سماجی مسائل کو منعکس کیا۔ مائیکل ڈی مونٹیگنے نے فرانسیسی سیاست پر اپنی تنقیدات کو ایک گفتگو کی شکل دی جو اس نے برازیل سے آنے والے ایک انڈین سردار کے ساتھ کی، اور مانٹیسکو نے یورپ کی برائیوں کو مسترد کرنے کے لیے ایک ایرانی سیاح کی طرف سے لکھے ہوئے خطوط کو وسیلہ بنایا۔

اگر مغربی تہذیب پر ہمارے اپنے بلند پایہ ماہرین موجود ہوتے تو ہمیں معلوم ہو جاتا کہ مغرب ایک متنوع، کثیر اور پیچیدہ وجود ہے۔ اس کے سیاسی کلچر نے خوف و دہشت کو پروان چڑھایا لیکن ساتھ ہی ایسے ادارے بھی تخلیق کیے جن سے انسانی وقار کا تحفظ ہوا۔ ان میں سے ایک دہشت وہ سامراج تھا جو مسلمانوں اور دیگر مملکتوں پر مسلط کیا گیا لیکن اس چیز نے بھی خود یورپ والوں کو اتنا ہی زیادہ نقصان پہنچایا جتنا کہ ہمیں ہوا۔ اس بات کو وہ شخص بہتر طور پر جان سکتا ہے جس کو جنگ عظیم اول میں ہلاک شدگان کی تعداد سے واقفیت ہو۔ ہمارے ماہرین ہمیں یہ سمجھنے میں مدد دے سکتے ہیں کہ سید قطب اور خمینی کا انسانی